# فلسفۂ قدرت

## PHILOSOPHY OF NATURE

کیلاش ناتھ کول



گیان سنگم لیباریٹری

۱۶۔ گوکھلے مارگ

لکھنؤ

# فلسفۂ قدرت

## PHILOSOPHY OF NATURE
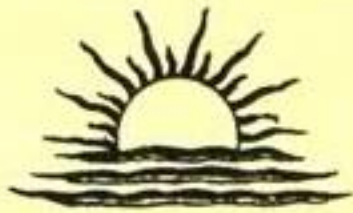
کیلاش ناتھ کول

گیان سنگم لیباریٹری
۱۶۔ گوکھلے مارگ
لکھنؤ

اشاعتِ اوّل : اپریل ۱۹۸۱ء

تعداد : ایک ہزار

ناشر : کیلاش ناتھ کول

مطبوعہ : لکھنؤ پبلشنگ ہاؤس، لکھنؤ

باہتمام

موہن لعل ویشنوی

# پیش لفظ

یہ کہانی ۱۹۴۲ء میں لندن میں جب میں گھر میں ایک بم سے
حفاظت کے لیے ایک گڑھے میں لیٹا ہوا تھا۔ جس کے اوپر ٹین کی
چادر ڈال کر بالو کے تھیلے رکھ دئے گئے تھے۔ لیٹے لیٹے آدھے سوتے،
آدھے جاگنے کی حالت میں خود بخود اس طرح میرے سامنے سے گذر گئی
جس طرح کوئی سینما کی تصویر دیکھ لیتا ہے۔ اس لئے میں اس کا اپنے
آپ کو مصنّف نہیں مانتا ہوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ زندگی میں جو کچھ مجھ
پر بیتی ہے یا میں نے پڑھا ہے، وہ خود بخود آپس میں مل گیا ہے۔ اور
ایک کہانی کی شکل میں ظاہر ہو گیا ہے۔ ۱۹۴۲ء میرے لیے ایک بہت
خطرناک وقت تھا۔ رات دن بم گرتے تھے، اور میں اکیلا اپنی گرہستی
لندن میں چلاتا تھا اور رایل بوٹینک گارڈنز کیو (Royal Botanic Gardens, Kew)
میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کی کوشش کرتا تھا۔ مجھ کو برٹش
میوزیم میں بھی کام کرنے کی اجازت مل گئی تھی۔ میں یہی سوچا رہتا

تھا کہ اپنی علمی واقفیت بڑھانے کے لیے اس سے اچھا موقع پھر
کبھی شاید مجھے نہ ملے میں ان خیالوں میں اتنا غرق تھا کہ لڑائی کی تکلیفوں
کی مجھے کوئی فکر نہیں تھی۔ ایسے وقت اس کہانی کا آجانا میرے لئے ایک،
اچنبھے کی بات تھی۔

ہندستان واپس آنے پر اور لندن میں اپنے دوستوں کو یہ کہانی
میں نے زبانی کئی دفعہ سنائی، لیکن چھپوانے کا خیال مجھے نہیں ہوا۔ میرے
دوستوں نے مجھے بار بار کہا تم اسے چھپوا دو، بہت سے نوجوانوں کا فائدہ
ہو گا۔ میں تقدیر پر بھروسہ کرنے والا ہوں۔ جو ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا۔
جو نہیں ہونا ہے وہ کتنی کوشش کی جائے نہیں ہو گا۔ اس لئے کسی کو
نصیحت دینا اس خیال سے کہ وہ مان جائے گا میرے خیال میں نہیں آتا۔
اس کہانی سے کسی کو فائدہ پہنچے گا یا نہیں مجھ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔
یہ دوستوں کے مجبور کرنے پر میں نے چھپوا دی ہے شاید خدا کی مرضی اسی
میں ہو۔

اس کہانی کی اشاعت میں مسٹر موہن لعل وشنوی، تکنیکی معاون "اردو"
نیشنل بوٹینکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، لکھنؤ، کا تعاون شامل ہے۔

لکھنؤ۔ ۱۷ فروری ۱۹۷۱ء

کیلاش ناتھ کول

# فلسفۂ قدرت

## (۱)

بس ایسا سمجھئے، وہ بالکل آپ جیسا تھا۔ جس طرح آپ کسی وقت اسکول میں پڑھتے تھے اور اس میں ملک کے بڑے بڑے لیڈر آتے تھے، اس کے اسکول میں بھی آتے تھے۔ جس طرح آپ کے یہاں وہ تقریریں کرتے تھے، اس کے یہاں بھی کرتے تھے۔ کوئی کہتا تھا "اے نوجوانو! ملک کو تمہاری ضرورت ہے، تم ہی اس کو سنبھال سکتے ہو۔ ملک تباہ ہو رہا ہے، اس کو بچانا تمہارا فرض ہے، ملک تمہاری قربانیاں چاہتا ہے۔" کوئی کہتا تھا، "ہماری تہذیب خطرے میں ہے" ہمارا تمدن برباد کیا جا رہا ہے، ہماری مذہبی زندگی مٹائی جا رہی ہے" اے نوجوانو! تم ہی سب کو بچا سکتے ہو۔"

یہ لڑکا اچھے گھرانے کا تھا۔ ماں باپ نے گھر میں اس کو اچھی تعلیم دی تھی۔ ان سب کی تقریریں یہ لڑکا بڑے غور سے سنتا تھا، سوچتا تھا ـــــ یہ لوگ کتنے بڑے آدمی ہیں، کتنے خدا پرست ہیں، کتنے قوم پرست ہیں؟ انہوں نے کتنی بڑی بڑی قربانیاں کی ہیں! ملک انکی

کتنی عزّت کرتا ہے۔ میں بھی پڑھوں گا، میں قابل بنوں گا۔ ایک روز ان لوگوں کی طرح ملک کی خدمت کروں گا۔ مذہبی خیالات پھیلاؤں گا۔ لوگوں کو سچّا راستہ دکھلاؤں گا اور جس طرح یہ خلقِ خدا کی خدمت کرتے ہیں، میں بھی کروں گا۔

ایک وقت ایسا آیا جب اس نے اپنی تعلیم ختم کی۔ ماں باپ نے، اس خیال سے کہ لڑکا قابل ہے اور نوکری ملنے میں کوئی مشکل نہیں ہوگی، ایک اچھے گھرانے کی پڑھی لکھی تمیز دار لڑکی سے شادی کر دی۔ کچھ دنوں کے بعد اسے نوکری بھی مل گئی۔ پہلے روز جب وہ کام پر گیا، ڈائرکٹر صاحب نے بُلایا، اس کو ایک فائل دی اور کہا "اس کو پڑھو اور ایک نوٹ تیار کر کے دو"۔ لڑکے نے فائل کو لے کر، اپنی جگہ پر آکر، بڑھے غور سے اُسے پڑھا اور حکم کے مطابق ایک نوٹ تیار کیا اور یہ سوچ کر کہ ابھی میں نیا نیا آیا ہوں، دفتری کام سے ناواقف ہوں، آفس سُپرنٹنڈنٹ کو دکھانے کے لیے لے گیا۔ آفس سُپرنٹنڈنٹ نے نوٹ پڑھا، اور پھر گردن ٹیڑھی کر کے بڑے غور سے اس نوجوان کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے اس سے کہا، "صاحبزادے کیا ارادے ہیں؟ اپنی نوکری بھی کھوؤ گے اور ہماری بھی کھواؤ گے"۔ لڑکا کچھ نہیں سمجھ سکا، پریشان ہوا۔ اس نے بڑے غور سے ایک ایک پرچہ اس فائل کا پڑھا تھا سمجھنے کی کوشش بھی کی تھی۔ اس کو اپنی قابلیت پر پورا بھروسہ تھا۔ جو کچھ اس نے لکھا تھا وہ سچ تھا۔ جو کچھ کرنا تھا، وہ بھی قاعدے قانون

کے مطابق بتایا گیا تھا۔ سُپرنٹنڈنٹ کی بات سُن کر اس نے سوچا —— یہ پُرانے زمانے کے لوگ ہیں۔ ان کے کام کرنے کے طریقے بھی پُرانے ہوگئے ہیں۔ اس نے بغیر کچھ کہے سُپرنٹنڈنٹ سے فائل لے لی اور سیدھا ڈائرکٹر صاحب کے کمرہ میں چلا گیا۔ اور ان کو اپنا نوٹ دکھلایا۔ ڈائرکٹر صاحب جوں جوں پڑھتے گئے ان کی آنکھیں غصّہ سے سُرخ ہوتی گئیں۔ پھر انھوں نے فائل اٹھا کر لڑکے کے اُوپر دے ماری۔ اور کہا "یو فول گیٹ آؤٹ فرام ہیر" (بے وقوف! یہاں سے نکل جاؤ) فائل کے پرچے پھینکنے پر کمرہ میں اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ لڑکے نے ایک ایک پرچہ اکٹھا کیا اور فائل کو لے کر جب وہ کمرہ سے باہر نکلا، اس کی نظریں زمین کی طرف تھیں۔ ڈائرکٹر صاحب کے ڈانٹنے کی آواز اتنے زور کی تھی کہ باہر کے سب ہی دفتر والوں نے سُنی تھی۔ لڑکا جب سر جھکائے، کچھ سوچتا ہوا اپنے بیٹھنے کی جگہ کی طرف جا رہا تھا تو سُپرنٹنڈنٹ نے اس کو آواز دی، اور اپنے پاس بُلایا اور کہنے لگا، "اپنے آپ کو بہت قابل سمجھتے ہو، نوکری کرنے آئے ہو۔" یہ کہہ کر اس نے فائل لڑکے کے ہاتھ سے لے لی اور کان پر اٹکائی ہوئی پنسل ہاتھ سے اُتاری اور نوٹ کو پڑھنا شروع کیا۔ بیچ بیچ میں بہت سے جملے کاٹ دیئے۔ اور پھر لڑکے سے کہا۔ "جاؤ! ٹائپ کرو اور صاحب کو دے آؤ۔" لڑکا اپنی جگہ پر آیا، اور ٹھیک کیا ہوا نوٹ ٹائپ کیا۔ اور پھر اس کو بڑے غور سے پڑھا۔ سوچنے لگا —— فائل تو کچھ اور کہتی ہے اور نوٹ کچھ اور ہی کہتا ہے، یہ تو بالکل بے معنی سا ہو گیا ہے۔

لیکن اُٹھا اور ڈائرکٹر صاحب کے سامنے فائل رکھ دی۔ ڈائرکٹر صاحب نے نوٹ پڑھا اور خاموشی سے دستخط کر دئے، "لے جاؤ" اب جب وہ لڑکا کمرہ سے باہر نکل رہا تھا تو سوچ رہا تھا——— یہ لوگ بڑے بے ایمان ہیں۔ فائل کچھ کہتی ہے یہ حکم دوسرا دیتے ہیں۔ میں ان بے ایمانوں کے ساتھ کام نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی جگہ پر آیا۔ اپنا استعفا ٹائپ کیا، اور صاحب کی میز پر رکھ دیا اور گھر چلا آیا۔ اپنی بیوی سے کہا "میں نے استعفا دے دیا، بڑے بے ایمان لوگ ہیں۔ ان کے ساتھ میرا گزارہ نہیں ہوسکتا تھا۔" بیوی بیچاری کیا کہتی، چند دنوں کی بہو تھی، اس نے جاکر اپنی ساس کو بتا دیا۔ ساس نے اپنے خاوند کو بتا دیا، یعنی لڑکے کے باپ کو۔ باپ بولا میں تو پہلے سے ہی جانتا تھا۔ یہ تو اپنے آپ کو دُنیا کا ٹھیکہ دار سمجھتا ہے۔ بس، یہی ہیں جو دُنیا کو ایمان دار بنا کر چھوڑیں گے۔ اچھی خاصی نوکری مل گئی تھی، لات مار کر آ گئے۔ ارے، تم کو بے ایمانی اور ایمانداری سے کیا تعلق؟ جو افسر نے کہا ٹائپ کرکے دے دیتے۔ ذمہ داری تو اس کی ہے، جو دستخط کرتا ہے۔ اب کیا کریں گے؟ گھر بیٹھیں گے؟" لیکن باپ لڑکے کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کے مزاج سے واقف تھا۔ لڑکے سے اس نے کچھ نہیں کہا۔ گھر میں ایک سنّاٹا سا ہوگیا تھا کوئی کسی سے بول نہیں رہا تھا۔ کچھ دیر لڑکا اپنے کمرہ میں بیٹھا رہا پھر سوچا، چلو کافی ہاؤس چلیں، کچھ دل بہل جائے گا، کچھ دوستوں سے ملنا ہو جائے گا۔

کافی ہاؤس میں دوستوں سے ملا۔ ان سے، جو گزری تھی اس کا ذکر کیا۔ جو دفتر میں ہوا تھا، وہ سُنایا۔ دوستوں نے کہا۔ "ارے یار! ہم تو تمہیں ہمیشہ سے سُنتے اور سمجھتے رہے۔ ایسی اچھی نوکری ملی تھی، کیوں چھوڑ دی؟ تم سمجھتے ہو تمہاری ایسی حرکتوں سے دُنیا ایماندار ہو جائے گی۔ تم کو ایماندار ہونے کا بہت گھمنڈ ہے۔ ٹھیک ہے، ایمانداری اچھی چیز ہے۔ جہاں تک بن پڑے زندگی ایمانداری سے گزارنی چاہیے لیکن ساری دُنیا کو ایماندار بنانے کا ٹھیکہ لینا تو بھائی ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ بڑے بڑے پیغمبر، پیر، رِشی، مہاتما کوشش کرتے کرتے مر گئے وہ تو لوگوں کو ایماندار نہیں بنا سکے۔ تم کس کھیت کی مُولی ہو جو دنیا کو ٹھیک کرنے نکلے ہو۔" اس طرح کی فقرہ بازی بہت دیر تک ہوتی رہی۔ لڑکے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مُسکراتا رہا اور پھر گھر واپس آگیا۔ قابل تھا۔ کچھ روز کے بعد پھر نوکری مل گئی، لیکن وہاں بھی وہی قصہ ہوا جو پہلے دفتر میں ہوا تھا اور وہاں سے بھی اس کو استعفا دے کر گھر آنا پڑا۔ اس کو نوکریاں ملتی گئیں لیکن اپنے مزاج و عادت کی وجہ سے چند ہی دنوں کے بعد نوکری چھوڑ کر گھر آنا پڑتا تھا۔ ایک وقت ایسا آیا جب اس نے سوچا کہ نوکری کرنا بیکار ہے۔ ہر دفتر میں ایک ہی طرح کی زندگی ہے ان میں مجھ جیسے انسان کی گزر ناممکن ہے چلو، قوم کی خدمت کریں گے۔ کھانے کو دال روٹی مل جائے گی۔ ایک روز شہر میں جلسہ تھا۔ بڑے بڑے رہنمائے قوم آئے تھے۔ بڑا ہجوم تھا، ایک بڑے قابل و عالم رہنمائے قوم تقریر کر رہے تھے

اُن کی باتیں سُن کر لوگ اس طرح جوش میں آرہے تھے۔ جس طرح سمندر کی لہریں ہلکے ہلکے اُبھر کر ایک مقام پر بڑی اونچی ہو کر گر جاتی ہیں اور تھوڑی دیر کے بعد پھر چھوٹی چھوٹی لہریں پیدا ہوتی ہیں اور پہلے کی طرح اُبھرتی ہیں، اب کی دفعہ ان کی شکل پہلی شکل سے مختلف ہوتی ہے لیکن اُبھار اور اُتار ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ رہنمائے قوم بڑی خوبی سے الفاظ استعمال کر رہے تھے۔ وہ ملک کی مصیبتوں کی تصویر کھینچ رہے تھے اور لوگ اس تصویر کو دیکھ کر اس طرح جوش میں آرہے تھے جیسے وہ خود اس تصویر کے کسی حصّہ کی زندگی سے بندھے ہوئے ہوں۔ اس لڑکے پر بھی ان کی تقریر کا بڑا اثر ہوا۔ سوچا بڑا قابل انسان ہے۔ کاش، مجھے اس کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل جاوے، تو کتنا اچھا ہو۔ یہ سوچ کر اس نے اُن کی بابت واقفیت بڑھائی۔ اور تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی۔ ہلکے ہلکے اُن کی مدد سے پارٹی کا ممبر بننے میں کامیابی حاصل کی۔ یہ لڑکا خود بھی قابل تھا۔ بہت جلد پارٹی کے اندرونی حلقوں میں داخل ہونے کا اس کو موقع مل گیا۔ ایک دن جب پارٹی کی میٹنگ ہو رہی تھی، کچھ تجویزیں پیش کی گئیں، سب لوگ تائید کر رہے تھے لیکن لڑکے نے ان کی مخالفت کی، اور کہا، "یہ تو پارٹی کے بُنیادی اُصولوں کے خلاف بات ہے۔ ان کو کسی طرح بھی اختیار نہیں کرنا چاہیے" لوگوں نے اس کی بات کو تسلیم کیا، کہا، ــــ صحیح بات کہتے ہو، لیکن یہ تو بتاؤ کہ پارٹی کیسے چلے گی؟ بھائی بہت سی باتیں پبلک کے لیے ہوتی ہیں لیکن ان اصولوں پر پارٹی تو نہیں چل سکتی۔ ہم کو ہمیشہ کہنے اور کرنے میں فرق کرنا پڑتا ہے۔ دُنیا

ایسی ہی ہے اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔ اچھے سے اچھا کام کرنے میں بھی بڑے آدمیوں کی مدد لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ تمہاری اصول پرستی ہمیشہ نہیں چل سکتی۔ اصولوں میں یقین کرنا ضروری ہے لیکن عمل میں مصلحت کا خیال بھی رکھنا ضروری ہے، وقت کے ساتھ ساتھ ہم کو بدلنا چاہیے۔ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو ہماری پارٹی ختم ہو جائے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمارے اصول بھی ختم ہو جائیں گے۔ اور جب پارٹی ہی نہیں رہے گی تو خدمت کرنے کی طاقت بھی ہم میں نہیں رہے گی۔ طاقت رکھنا ہمارے لیے ضروری ہے، چاہے وہ کسی طرح سے حاصل ہو سکے۔ اسی طرح کی بہت باتیں ہوتی رہیں۔ لیکن کسی نے بھی اس لڑکے کی بات نہیں مانی۔ تجویزیں سب ہی اختیار کر لی گئیں۔ لڑکا جب گھر واپس آ رہا تھا تو پارٹی چھوڑ چکا تھا۔ سوچ رہا تھا یہ لوگ بہروپیئے ہیں۔ اندر کچھ، باہر کچھ۔ قوم کو دھوکا دینے والے ہیں، ان کے ساتھ مل کر کام کرنا بے وقوفی ہی نہیں، بلکہ لامذہبیت ہے۔

کچھ دنوں کے بعد وہ لڑکا دوسری پارٹی میں شامل ہو گیا۔ کام کیا لیکن آخیر میں معلوم ہوا کہ وہ بھی اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ اور ہی ہیں۔ اسی طرح برابر وہ مختلف پارٹیوں میں شامل ہوتا رہا لیکن آخر میں نتیجہ ایک ہی نکلا۔ "ہاتھی کے دانت کھانے کے اور، اور دکھانے کے اور ہی ہوتے ہیں۔"

ایک روز جب وہ ایک پارٹی سے استعفا دے کر گھر واپس آ رہا تھا اس کے قدم گھر کی طرف نہیں جا رہے تھے بلکہ شہر سے دور ایک ندی کی طرف

جا رہے تھے، جب وہ ندی کے کنارے پہونچا تو ایک پیڑ کے تنے کا سہارا لے کر ٹانگیں پھیلا کر زمین پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا ــــــ زندگی میں کیا کیا ارادے کیے تھے، میں یہ کروں گا، میں وہ کروں گا۔ لیکن آج سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟ کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ کس کا سہارا لوں؟ ہر طرف چالباز، مکّار، فریبی بھرے پڑے ہیں۔ اکیلا میں کیا کر سکتا ہوں؟ اور اگر اپنے سب اِرادوں کو بھی بھول جاؤں تب بھی مجھ سے وہ سب باتیں نہیں ہو سکیں گی جو یہ جماعتیں مجھ سے کروانا چاہتی ہیں۔ کچھ بھی ہو جائے میں اپنے راستہ کو بدل نہیں سکتا۔

جب وہ اس طرح سے سوچ رہا تھا، ہلکے ہلکے دن ڈھلتا گیا۔ چاروں طرف اندھیرا ہوتا گیا۔ اس نے بے اختیار آسمان کی طرف دیکھ کر کچھ کہنے کا اِرادہ کیا، ایسا لگتا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا ــــــ اے خُدا! تو ہی بتا کہ تو نے کس مصلحت سے یہ دُنیا بنائی ہے؟ لیکن اس نے دیکھا کہ مغرب کی طرف دُوج کا چاند ابھی غروب نہیں ہوا تھا۔ بڑا خوبصورت نظر آرہا تھا۔ وہ چاند سے باتیں کرنے لگا۔ اس نے دریافت کیا۔ " اے چاند! تو ہی بتا یہ دُنیا کن اُصولوں پر قائم ہے؟ یہاں نہ ایمانداری ہے نہ وفاداری۔ کون سی چیز ایسی ہے جس کا سہارا لے کر کوئی اپنی زندگی چلا سکتا ہے؟ لیکن چاند کیا جواب دیتا۔ چاند غروب ہو گیا اور چاروں طرف اور بھی زیادہ اندھیرا ہو گیا۔ لڑکے نے سر گھما کر شہر کی طرف دیکھا، سوچنے لگا ــــــ کاش! اب بھی کوئی روشنی کی جھلک دکھائی دے جائے۔ کوئی

سہارا نظر آجائے۔ لیکن جب کچھ نظر نہیں آیا تو جس ارادہ سے وہ وہاں آیا تھا، اس کو پورا کرنے کے لیے کوشش کی۔ اٹھنا چاہتا تھا لیکن اُٹھ نہیں سکا۔ بہت دیر تک ایک طرح بیٹھنے پر ٹانگیں اکثر سُن ہو جاتی ہیں۔ یہ خیال کر کے مالش کرنے کے لئے اس نے ہاتھ آگے بڑھانا چاہا، لیکن ہاتھ بھی نہیں ہلے۔ تب ذرا پریشان ہوا۔ "نہ ہاتھ ہلتے ہیں نہ پیر ہلتے ہیں یہ ماجرا کیا ہے؟" اس کو اب شہر کی روشنی بھی نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ اندھیری رات میں تارے تو دکھائی دیتے ہیں وہ بھی نہیں دکھائی دے رہے تھے۔ شہر کی طرف سے پہلے آوازیں آرہی تھیں اب وہ بھی نہیں سُنائی دے رہی تھیں۔ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ ابھی تو اچھا خاصا تھا۔ کیا مجھ پر فالج گر گیا ہے؟ نہ آنکھیں کام کرتی ہیں نہ کان نہ ہاتھ کام کرتے ہیں نہ پاؤں۔" وہ گھبرا گیا۔ سوچنے لگا —— "میں ابھی جوان ہوں، بالکل تندرست ہوں۔ ابھی تو آکر بیٹھا تھا یہ مجھے کیا ہو گیا؟ میں مرنے والا نہیں ہوں۔ کوئی مجھے اسپتال لے چلے۔ میں اب بھی ٹھیک ہو سکتا ہوں۔ مجھ میں کچھ بھی نہیں بگڑا ہے۔" یہ سوچ کر وہ مدد کے لیے چیخا۔ لیکن گلے سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ اب اسے پورا یقین ہو گیا کہ وہ مر رہا ہے وہ اندر ہی اندر اُلجھ رہا تھا چاہتا تھا کوئی اس کی بے بسی کو دیکھے۔ اس کی مدد کرے۔ اسے خیال تھا کہ وہ اب بھی بچایا جا سکتا ہے۔ جب وہ ایسی حالت میں تھا، دیکھتا کیا ہے کہ سامنے فرشتۂ موت کھڑا ہے۔ موت کے فرشتہ کو دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔

فرشتہ بولا۔ "نوجوان گھبراتا کیوں ہے؟ تو کس اِرادے سے آیا تھا؟ تو نے ہی تو مجھے بُلایا ہے۔ چاند سے تو کیا سوال کر رہا تھا کہ خُدا نے دُنیا کس مصلحت سے بنائی؟ وہ کیا بتلائے گا؟ چاند خود تو تھا ہی نہیں ـــــ میں تھا (موت بولی) میں بتاؤں گا دُنیا کس مصلحت سے خُدا نے بنائی ہے۔ تو میرے ساتھ چل"

لڑکا:ـــ چلوں کیسے؟ ٹانگوں نے تو جواب دے دیا ہے۔"

فرشتہ :ـــ "بے وقوف، تجھے ایسی دُنیا میں لے جا رہا ہوں جہاں بغیر ٹانگوں کے ہی چلتے ہیں۔"

لڑکا:ـــ "مجھے دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ کدھر چلوں؟"

فرشتہ:ـــ "بے وقوف، یہ اندھیرا تو کچھ بھی نہیں ہے اس سے بھی زیادہ تاریکی میں زندگی کا بھید چھپا ہے" یہ کہہ کر فرشتہ نے لڑکے کی رُوح اس کے جسم سے نکال لی۔ اور جس طرح بارش کی ایک بُوند سمندر میں گر جاتی ہے، اس نے اس کو لاانتہا میں ڈال دیا۔ اور پھر جس طرح غوطہ خور سمندر سے موتی نکال لاتا ہے اس نے اس کی روح اس کے جسم سے جوڑ دی اور کہا۔ "تو نے دیکھا اس لاانتہا میں یہ خیال پیدا ہوا۔ "میں ہوں" اور ذرّہ ذرّہ نے کہا۔ "میں ہوں، میں ہوں، میں ہوں۔" اور یہ کائنات اور یہ جہان بن گیا

جیسا تُو دیکھتا ہے۔

خُدا نے دیکھا اور کہا "دُنیا اچھی بنی ہے، لیکن اس میں ایک کمی ہے اس میں ایک ایسی چیز ہونا چاہیے جو مجھ جیسی ہو اور مجھ جیسی نہ ہو۔" تب اُس نے ایک انسان پیدا کیا جو اپنی بناوٹ کے لحاظ سے محدود ہے خُدا کی طرح لا انتہا نہیں ہے۔ لیکن اپنی روحانیت کی وجہ سے خُدا جیسا ہے۔

خُدا نے دُنیا کے جتنے فرشتے، دُنیا کی جتنی طاقتیں تھیں ان کو اکٹھا کیا اور اُن سے کہا—— "میں نے یہ انسان پیدا کیا ہے یہ سارے جہان پر حکومت کرے گا۔ تم کو اس کا کہنا ماننا پڑے گا۔" سب نے اس کو منظور کیا لیکن موت کے فرشتہ نے انکار کیا۔ اس نے کہا۔ "یہ مٹی کا پُتلا ہے میں اس کو مٹی میں مِلا دوں گا۔ میں اس کی طاقت کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔" اس نے خُدا کو انسان بناتے ہوئے دیکھا تھا، جب وہ مٹی کا پُتلا تھا۔ لیکن اس کو رُوحانی طاقت دیتے وقت نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے دھوکا کھا گیا۔ کہتا چلا گیا یہ خاک کا ہے اس کو میں خاک میں مِلا سکتا ہوں۔"

خُدا بولا: "تم دھوکہ کھا رہے ہو۔ تم ایسا نہیں کر سکو گے۔"

فرشتہ بولا: "آپ مجھے وقت دیں میں کر کے دکھا دوں گا۔"

خُدا بولا: "کتنا وقت چاہتے ہو؟"

فرشتہ بولا: "ایک قیامت کا"

خُدا نے کہا: "منظور۔ لیکن ایک شرط ہے، تم میرے بندہ پر حملہ نہیں کر سکو گے جس دن تم میرے بندہ پر حملہ کرو گے اسی

روز قیامت[1] ہو جائے گی اور تم بھی ختم ہو جاؤ گے۔"

فرشتہ نے منظور کیا۔

خُدا چلے گئے۔

فرشتہ سوچنے لگا۔ خُدا نے شرط تو بڑی زبردست لگائی ہے میں اگر بندہ پر حملہ نہیں کر سکتا تو اس کو ماروں گا کس طرح؟ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس کے چہرہ پر مسکراہٹ آئی۔ ایسا لگا کوئی راستہ نظر آ گیا ہے۔ اگر میں بندہ پر حملہ نہیں کر سکتا ہوں تو مجھے اس کو بندگی سے ہٹانا ہو گا۔ لیکن میں اُسے بندگی سے کیسے ہٹاؤں گا؟ خُدا نے سب کچھ تو اُسے دے دیا ہے پھر وہ بندگی سے کیسے ہٹے گا۔ سوچتا گیا، اور سوچتا گیا۔ کون سی چیز ایسی ہے جو خُدا نے اُسے نہیں دی ہے۔ اگر میں وہ چیز اسے دے سکوں، جو خُدا نے اُسے (انسان کو) نہیں دی ہے، تو وہ میرا مُرید بنے گا، اور جب وہ میرا مُرید

---

[1] دُنیا کی تاریخ میں پیغمبر کی ہستی ایک تمدّن کے لئے ضروری ہوتی ہے جب کوئی جماعت اپنے پیغمبر سے علیحدہ ہو جاتی ہے یا علیحدہ کر دی جاتی ہے اس جماعت کا تمدّن بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اُس قوم کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ کوئی تمدّن بغیر پیغمبر کی ہستی کے پیدا نہیں ہوتا۔ اس تاریخی واقعہ کو اس مقام پر خُدا کی طرف سے بتایا گیا ہے کہ خُدا کا بندہ یعنی پیغمبر، خُدا نے محفوظ کیا ہے۔ روم حکومت نے عیسیٰ مسیح کو صلیب پر چڑھایا اور نتیجہ یہ نکلا کہ روم حکومت اپنے سے کم طاقتور، کم تہذیب یافتہ، جنگلی طاقتوں کا شکار ہو گئی۔ اسی طرح اگر غور سے انسانی تاریخ پڑھی جائے تو یہی دکھائی دیگا کہ دُنیا کے تمدّن اس وقت ختم ہو گئے ہیں جب قوموں نے خُدا کے بندوں سے اپنے آپ کو علیحدہ کر لیا ہے۔

بنے گا تو میں اُسے ماروں گا۔

اُس کے چہرے پر پھر ایک مُسکراہٹ آئی۔ ایسا لگتا تھا کہ فرشتہ کو معلوم ہو گیا ہے کہ خُدا نے انسان کو کیا نہیں دیا ہے۔ وہ چلا اور اس جنّتی باغ میں جہاں انسان رکھا گیا تھا، پہنچا۔

جب انسان نے فرشتہ کو انسانی شکل میں آتے ہوئے دیکھا وہ اسکی طرف کھنچا۔ فرشتہ کی شکل خطرناک[1] تھی، لیکن اس کی آنکھوں میں ایک عجیب کشش تھی۔ نہ چاہنے پر بھی ہر چیز اس کی طرف کھسکتی چلی جاتی تھی۔ انسان اس کی طرف کھسکتا ہی گیا۔ جب اس کے پاس پہنچا، اس نے سوال کیا۔ آپ کون ہیں؟"

فرشتہ نے کہا: "تمھارا دوست[2]"

انسان بولا: "آپ کس لئے آئے ہیں؟"

فرشتہ بولا: "تمھاری مدد کے لئے۔"

---

[1] موت ایک خطرناک چیز ہے کوئی زندگی مرنا نہیں چاہتی، لیکن ہر ایک زندہ چیز وقت کے ساتھ موت کی طرف کھنچتی چلی جاتی ہے۔

[2] موت سے زیادہ عزیز دوست انسان کا کوئی نہیں ہوتا۔ جب مصیبتیں پڑتی ہیں اور کوئی ساتھی نہیں ملتا، جاندار چیزیں موت کا سہارا لے کر خودکشی کر لیتی ہیں۔ ایک تجربہ میں دیکھا گیا کہ ایک افعی سانپ کو بہت دیر تک تنگ کیا گیا۔ جب وہ کچھ نہ کر سکا تو اس نے اپنے آپ کو کاٹ لیا اور مر گیا۔ صرف انسان خودکشی نہیں کرتے بلکہ جانور بھی مجبور ہو کر خودکشی کر لیتے ہیں۔

انسان بولا: "آپ ہماری کیا مدد کریں گے؟ خُدا نے ہمیں سب کچھ دیا ہے۔"

فرشتہ بولا: "نہیں، تم دھوکے میں ہو، تم کو خُدا نے سب کچھ نہیں دیا ہے۔"

انسان بولا: "نہیں، ہمیں خُدا نے سب کچھ دیا ہے۔"

فرشتہ نے کہا: "تم سیب کھاتے ہو؟"

انسان نے کہا: "کھاتے ہیں۔"

فرشتہ بولا: "ہمیشہ کھاتے ہو؟"

انسان بولا: "نہیں، موسم میں کھاتے ہیں۔"

فرشتہ بولا: "ہم تمھیں ایسی ترکیب بتائیں کہ تم بارہ مہینہ سیب کھاؤ۔"

انسان بولا: "ہم کیوں کھائیں؟ بے موسم کھائیں گے تو بیمار پڑ جائینگے۔ ہم کو ہر ایک موسم کے لئے خُدا نے پھل دئے ہیں۔ ہم وہ کھاتے ہیں اور تندرست رہتے ہیں۔"

فرشتہ نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح انسان کو توڑے لیکن وہ نہیں ٹوٹا۔ یہی کہتا رہا کہ "جو خُدا نے ہم کو دیا ہے وہی ہمارے لئے ٹھیک ہے۔"

فرشتہ نے دیکھا کہ اس کی بیوی اس کے پاس بیٹھی ہے۔ اس سے دریافت کیا۔ "تمھارے بچے ہیں؟"

بیوی نے کہا: "ہیں۔"

فرشتہ بولا ، "دودھ پلاتی ہو ؟"

بیوی بولی : "ہاں، کبھی کم ہوجاتا ہے تو میرے پاس گائے ہے ۔"

فرشتہ نے دریافت کیا۔ "کتنا دودھ دیتی ہے ؟"

بیوی بولی : "صبح وشام یہی سیر، سوا سیر دے دیتی ہے، کام چل جاتا ہے ۔"

فرشتہ نے کہا: "تمھیں ہم ایسی گائے دیں جو مَن بھر دودھ دے ۔"

عورت یہ سُن کر اُچھل پڑی، "میں ضرور لوں گی ۔" وہ چلاّ چلاّ کر کہنے لگی ۔
"ایسی گائے میں ضرور لوں گی، ایسی گائے میں ضرور لونگی"۔
اور کہتے کہتے اپنے خاوند کی طرف مڑ کر دیکھنے لگی، اور کہنے لگی، دیکھو! اب تم منع نہ کرنا ۔ میں تمھاری ہمیشہ ہر ایک بات مانتی رہی ہوں، لیکن میں یہ گائے لے کر رہُوں گی ۔"

خاوند بولا : "تو نے کبھی سوچا کہ من بھر دُودھ دینے والی گائے کا تھَن کتنا بڑا ہوگا، ایک بالٹی کے برابر ہوگا۔ جب وہ چلے گی تو اس کو کتنی تکلیف ہوگی ۔ اس کا بڑا تھن ہونے کی وجہ سے اس کو تھَن کی بیماریاں ہوجائیں گی ۔ تو نے اپنا ہی خیال کیا، گائے کی زندگی کا خیال نہیں کیا۔ خُدا نے ہم کو دُنیا میں بھیجا تھا کہ ہم قانونِ قدرت کی حفاظت

---

لہ قرآن میں ایک آیت ہے خُدا کہتا ہے تمھاری بیویاں اور تمھارے بچّے تمھاری کمزوریاں ہیں۔

کریں۔ اگر ہم اپنے فائدے کے لئے اسے توڑنے لگیں تو
دنیا میں قانون پر کون چلے گا؟ دُنیا برباد ہوجائے گی۔"

لیکن اس کی بیوی نے نہ مانا۔ کہنے لگی "مجھے گائے سے کیا تعلق، مجھے دُودھ چاہیے۔ اکثر میرے دُودھ نہیں ہوتا، میرے بچے بغیر دُودھ کے ہی سوجاتے ہیں۔ میرے پاس دُودھ ہوگا، میں اپنے بچّوں کو پلاؤں گی، مکھن تیار کروں گی، گھی تیار کروں گی، کھیر بناؤں گی۔"

اس کا خاوند بار بار اپنی بیوی کو سمجھاتا رہا لیکن وہ نہیں مانی۔ یہی کہتی رہی، میں ضرور لوں گی، ضرور لوں گی۔"

خاوند نے سوچا: "یہ عورت، جو ہمیشہ میرا کہنا مانتی ہے۔ آج میرا کہنا نہیں مان رہی ہے، یہ وہ عورت تھی، جب میں دل میں کوئی بات سوچتا تھا، یہ خود ہی بول اٹھتی تھی کہ اجی آج یہ کام کرنے کو دل چاہتا ہے۔"

میں کہتا تھا: "یہ تو میں تم سے کہنے ہی والا تھا، تمھیں کیسے معلوم ہوگیا۔" لیکن آج میں اس کو اتنا سمجھا رہا ہوں، لیکن یہ میری بات مان نہیں رہی ہے۔ میری بات سمجھ نہیں رہی ہے۔ یہ اجنبی آدمی کون آیا ہے جس نے ہم میں پھُوٹ پیدا کر دی ہے۔ خاوند نے مُڑ کر بڑے غور سے اس اجنبی انسان یعنی فرشتۂ موت کو جو انسانی شکل بنا کر آیا تھا، بڑے غور سے دیکھا اور دیکھتا ہی چلا گیا۔ دیکھتے دیکھتے اس اجنبی کی آنکھیں اس کو دو بڑی سُرنگوں کی طرح دکھائی دیں۔ اُن سُرنگوں میں اس کو اپنا، اپنے خاندان کا انسانی

نسل کا مستقبل دکھائی دے گیا۔ اس کو دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ دل ہی دل میں کہنے لگا۔ "ارے غضب ہو گیا۔ یہ تو خدا کا بھیجا ہوا پیغمبر ہے۔" یہ تو پیغام لایا ہے۔ اے انسانو! اب تم اس طرح نہیں رہ سکو گے۔ تمہارے بچے ہوں گے، اور پھر اسی طرح نسل بعد نسل بڑھتے جاؤ گے، تم ساری دنیا میں پھیل جاؤ گے۔ تم خاندانوں میں، فرقوں میں، قوموں میں، تقسیم ہو جاؤ گے آپس میں ایک دوسرے کو نہیں پہچانو گے، لڑو گے، ایک دوسرے کو مارو گے، ایک دوسرے کو تباہ کرنے کی کوشش کرو گے، لیکن جتنا لڑو گے، مارو گے اور مرو گے، اتنا ہی پھولو گے اور پھلو گے۔

جب انسان فرشتہ کی آنکھوں میں انسانی زندگی کا مستقبل دیکھ رہا تھا، فرشتۂ موت کچھ نہیں سمجھ رہا تھا۔ وہ صرف اتنا ہی سمجھا کہ انسان میرا مُرید بننے کے لیے تیار ہو رہا ہے۔

انسان نے ہاتھ جوڑ کر کہا، "مجھے معاف کیجئے! مجھ سے بڑی خطا ہو گئی، میں نے آپ کو بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہا، آپ تشریف رکھیے، ہم جنگلی انسان ہیں، ہم کو آداب سے بہت کم واقفیت ہے۔ ہمیں معاف کیجئے، سکھایئے آپ کیا سکھانا چاہتے ہیں۔ آپ میرے اُستاد ہیں، میں آپ کا شاگرد۔

فرشتہ نے انسان کو اپنے علم سے آگاہ کیا اور جیسے ہی انسان نے اس کو تسلیم کیا، ویسے ہی جس طرح اولا گرنے سے پہلے زمین سے مٹی تیزی کے ساتھ اُڑ کر آسمان کی طرف جاتی ہے، اور بجلی کڑکتی ہے، اسی طرح سے وہ اجنبی انسان یعنی فرشتۂ موت انسان کی نظر سے غائب ہو گیا۔ اور آسمان سے برابر

قہقہہ کی آوازیں لگاتار آتی رہیں۔ فرشتۂ یعنی فرشتۂ موت برابر کہہ رہا تھا، "یہ انسان میرا مُرید ہو گیا ہے۔ میرے اب بس میں آگیا ہے۔ بچ کر کہاں جائے گا۔ خاک کا تھا میں اس کو خاک میں مِلا کر رہوں گا۔"

انسان گھبرا گیا۔ یہ کیا ہوا؟ یہ اجنبی کہاں گیا؟ اسے قہقہہ کی آوازیں سُنائی دے رہی تھیں۔ ڈر کے مارے وہ وقت سے پہلے اپنے غار میں چلا گیا۔ اب وہ پہلے کی طرح بے فکر اپنے باغ میں گھوم نہیں سکتا تھا۔ اُسے ایسا لگتا تھا کہ وہاں کوئی اجنبی نقصان دینے والی طاقت آبسی ہے۔ جہاں شام ہوئی وہ اپنے غار میں چھُپ جاتا تھا اور باہر تیز ہَوا کے چلنے سے جو آوازیں پیدا ہوتی تھیں۔ اُن کو بڑی پریشان حالت میں سُنتا رہتا تھا۔ غار میں آگ جلا کر بیٹھتے وقت چمنی میں باہر کی آوازیں اس کو گونجتی ہوئی سُنائی دیتی تھیں۔ ہوہو ..... ہوہو ..... ہوہو .....، یہ آوازیں اس کو ڈراتی تھیں۔ وہ اپنی بیوی سے بار بار کہتا تھا کوئی مصیبت آنے والی ہے۔ دن میں جب وہ باہر باغ میں گھومتا تھا، پہلے کی طرح باغ کے جانور اس کے نزدیک نہیں آتے تھے۔ وہ اس سے ڈرتے تھے اور دُور دُور رہتے تھے۔ کیا وہ بھی سمجھ گئے تھے کہ کوئی مصیبت آنے والی ہے اور بچنے کا کوئی راستہ ڈھونڈتے تھے۔ گلہریاں، چڑیاں اور ہرن پہلے اس کے پاس بغیر جھجک کے آتے تھے اور کھانا مانگتے تھے۔ اب کھانا دکھلانے پر بھی وہ دُور دُور رہتے ہیں اور اِدھر اُدھر بھاگ جاتے تھے۔ اس کا باغ اب بھی خوبصورت نظر آرہا تھا، لیکن درختوں اور پودوں کے پتّے پہلے کی طرح چمکدار نہیں تھے۔ روز بروز پتّوں کا رنگ بدلتا

گیا، اس میں پیلا پن اور سُرخی بڑھتی گئی، اب بھی وہ خوبصورت نظر آتے تھے لیکن یہ خوبصورتی پہلی خوبصورتی سے مختلف تھی، اس کو دیکھ کر ڈر لگتا تھا۔ کتنے دن یہ خوبصورتی رہے گی، دل میں یہ سوچتا تھا، باغ کے پتّے بعض بعض مقام پر اتنے سُرخ ہو گئے تھے کہ لگتا تھا کہ درختوں میں، بیلوں میں آگ لگ گئی ہے۔ باغ بڑا ڈراونا ہو گیا تھا۔ یہ سب دیکھ کر انسان اُلجھ کر اپنی بیوی سے کہتا تھا، "تو نہیں مانی، تیری وجہ سے ہی یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ اگر تو خاموش رہتی تو میں اس اجنبی سے کوئی تعلق قائم نہیں کرتا۔"

کچھ دنوں کے بعد باغ میں ایک نیا گُل کھلا۔ ایک نئے اچنبھے کی بات ہوئی۔ وہ خوبصورت رنگ برنگ کے پتّے سُوکھتے گئے اور جھڑتے گئے۔ ہوائیں سائیں سائیں دن رات چلا کرتی تھیں اور پتّوں کو شاخوں سے گراتیں اور باغ کی زمین پر اِدھر اُدھر پھیلاتیں، لُڑھکاتیں اور طرح طرح کی آوازیں پیدا کرتی تھیں۔ جانور اور پرندے اپنی جان بچانے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ باغ ہلکے ہلکے اُجڑتا دکھائی دے رہا تھا۔ پتّے گرنے کی وجہ سے درخت ننگے نظر آرہے تھے۔ انسان دیکھ کر حیران تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا، یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟ ایک روز جب وہ صبح اُٹھا اس نے دیکھا کہ چاروں طرف ہر چیز سفید ہی سفید نظر آرہی ہے۔ درختوں پر ایسا لگتا تھا کسی نے رُوئی کے گالے لٹکا دئے ہیں اور زمین پر ایسا لگتا تھا کہ کسی شکاری نے دُنیا کی سب چڑیاں مار کر انکے پَر[1]

---

[1] روسی زبان میں چڑیوں کے پَر اور برف جو آسمان سے گرتی ہے دونوں کے لیے ایک ہی لفظ ہے کیونکہ برف روئی کے گالوں کی طرح ملائم چڑیوں کے پَروں کی طرح ہلکی اور سفید نظر آتی ہے۔

چاروں طرف بکھیر دیے ہیں۔ سب طرف سنّاٹا تھا۔ زندگی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ ہوا بڑی تیزی سے چل رہی تھی۔ آسمان میں فرشتۂ موت سب کچھ دیکھ کر بڑا خوش ہو رہا تھا اور کہہ رہا تھا ——— "میں نے دُنیا کو آج ختم کر دیا ہے اب خُدا کو بُلا کر دکھلاؤں گا کہ انسان خاک کا تھا میں نے اُسے خاک میں ملا دیا۔"
فرشتہ نے اپنی طاقت سے سب کو ختم کر دیا تھا بس وہی بچے جو چھُپ گئے تھے۔

اپنی کامیابی پر فرشتہ خوشی[1] سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ جوں جوں وہ خوش ہوتا گیا، اس کی مارنے کی طاقت جو دُنیا میں پھیلی ہوئی تھی، ہلکے ہلکے

---

[1] غصہ کی حالت میں ہم دوسرے کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ خوشی کی حالت میں ہم نقصان پہنچانے کی ذہنیت نہیں رکھ سکتے۔ اسی وجہ سے دُنیا میں جب کبھی جنگلی، غیر مہذب لوگوں نے تہذیب یافتہ لوگوں کو فتح کیا اور فتح کرنے کے بعد اس کی خوشی میں پرانی تہذیب کے نشانات جو باقی رہ گئے تھے ان کو تباہ کرنے سے چھوڑ دیا۔ انسانی تاریخ کا یہ ایک بڑا سبق ہم کو ملتا ہے۔ حال میں افریقہ کے جنگل میں جنگلی جانوروں کی حفاظت کے محکمہ کے افسر کی بیوی اپنے دو بچّے لے کر جب اپنے خاوند کے ساتھ جنگل میں ایک تنبو میں رہ رہی تھی، سیر کرنے نکل گئی، کچھ دیر بعد جنگل میں ایک شیرنی کو دیکھا جس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے بچّے تھے۔ اس کو دیکھ کر وہ سہم گئی۔ اُسے پورا یقین ہو گیا کہ شیرنی اس کو اور اس کے بچّوں کو کھا جائے گی۔ لیکن وہ گھبرائی نہیں اپنے دونوں بچّوں کے ہاتھوں کو پکڑ کر اس نے اپنے جسم سے چمٹا لیا اور خاموش کھڑی رہی شیرنی اپنے بچّوں کو لے کر اس کے قریب چلی آئی۔ اس کو پاس آکر سُونگھا لیکن حملہ نہیں کیا اور پھر چلی گئی۔ اس افسر کی بیوی نے واپس آکر اپنے خاوند سے کہا کہ تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم آئندہ کبھی کسی شیرنی کو نہیں مارو گے۔ یہ ایک مثال ہے کہ جانور بھی جب خُوش ہوتے ہیں تو کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے۔

سمٹ کر اس میں سماتی چلی گئی۔ اور دُنیا میں زندگی کے آثار پھر دوبارہ نظر آنے لگے۔ برف پگھل گئی اور اس کے نیچے دبے ہوئے پودے کلّے پھوٹنے لگے، چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ ہو گیا جب جانوروں نے دیکھا کہ خطرہ نکل گیا اور اپنی چھپنے کی جگہوں سے نکلے اور بے فکر گھومنے لگے۔ انسان بھی اپنے آپ کو اب محفوظ سمجھ کر غار سے باہر نکلا۔

فرشتہ نے جب دُنیا کی طرف دیکھا تو حیران ہو گیا اسے دُنیا میں پہلے سے زیادہ رونق نظر آئی۔ جو بیج تیز ہواؤں کی وجہ سے بکھر گئے تھے وہ جمنے پر نئی رونق پیدا کر رہے تھے۔ فرشتہ سوچتا ہی رہا —— یہ سب کیسے بچ گئے؟" معلوم ہوا چھپ گئے تھے۔ "اچھا! اب نکل آؤ۔" اس نے اپنے جادو کی طاقت سے ہر شاخ کی ہر کلی کو کھلنے دیا۔ کلیاں چٹختی ہی رہیں اور پھول کھلتے ہی رہے۔ کِھل کِھل کر وہ ختم ہو جاتے تھے۔ فرشتہ کہتا تھا۔ "اب کی دفعہ تم بچ نہیں سکو گے۔" ہر ایک زندگی کو وہ اُبھارتا ہی چلا گیا، اور ہر ایک کو باہر آنے کی دعوت دیتا چلا گیا۔ کہتا تھا —— "نکلو، اور نکلو" ہر زندگی اُبھرتی گئی اور دُنیا کی رونق کو بڑھاتی گئی، لیکن کسی کو بھی یہ خیال نہیں ہوا کہ یہ کھیل کس کا ہے۔ جب فرشتہ نے دیکھا کہ سب نکل آئے تو گرم ہوائیں چلانی شروع کیں۔ پھول سُوکھ گئے، ان کی شاخیں سُوکھ کر گرنے لگیں، درخت تیز گرم ہواؤں کی وجہ سے سُوکھ کر مر گئے۔ تالابوں کا، جھیلوں کا، ندی نالوں کا، سمندروں کا پانی سُوکھ گیا۔ دُنیا میں حشر کا عالم برپا ہو گیا (انسان چیخ اُٹھے یا الٰہی تو ہی بچا) اور پہلے کی طرح زندگی ختم ہوتی دکھائی

دینے لگی۔ فرشتہ نے دیکھا اور خوش ہوا۔ کہنے لگا —— "اب کی دفعہ نہیں بچو گے، سب کو میں نے ختم کر دیا۔ خاک کا تھا اور خاک میں ملا دیا۔"

یہ سوچ کر وہ خُوش ہوتا جاتا تھا۔ انتظار میں تھا کہ خُدا آئے اور یہ اس کو دِکھائے۔ اِس بار اس کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ لیکن ہوا کیا؟ جُوں جُوں وہ خوش ہوتا گیا، پہلے کی طرح اس کے مارنے کی طاقت اس میں آکر سماتی گئی۔ خوشی اور غصّہ دونوں ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ خوشی زندگی پیدا کرتی ہے، غصّہ زندگی کا دشمن ہے۔ اپنی کامیابی پر فرشتہ کی خوشی اس کے لیے رکاوٹ بن گئی۔

وہ پانی جو زمین سے اُڑ کر آسمان میں چلا گیا تھا، بادل بن کر ساری دُنیا کو سیراب کرنے لگا۔ جو جڑیں زمین میں رہ گئی تھیں، وہ نئے نئے کلّے پھوڑنے لگیں اور جو بیج بکھر گئے تھے، انہوں نے جم کر پہلے سے بڑا جنّتی باغ تیار کر دیا۔ جانور اور انسان جو غاروں میں چھپ گئے تھے وہ پھر باہر نکل کر اپنی زندگی آرام سے گزارنے لگے۔ جب فرشتہ نے دیکھا کہ بادل اس کے کام کو مٹانے میں لگے ہوئے ہیں، تو غصّہ میں آکر کہنے لگا —— "تمہاری ہمّت! میرے خلاف جا رہے ہو، تم نے دُنیا کو بچانے کا دعویٰ کیا ہے۔ میں تمہاری مدد سے انسانوں کی ہستی کو مٹا دوں گا۔ تم ہی سے ان کو مرواؤں گا،" کہنے لگا برسو اور برسو۔" اپنی طاقت سے وہ بارش کرواتا ہی گیا۔ اس نے بڑے بڑے سیلاب پیدا کیے۔ آبادیاں بہہ گئیں۔

چاروں طرف موت کا عالم ہو گیا۔ فرشتہ نے دیکھا اور بہت خُوش ہو کر کہنے لگا۔ "خاک کا تھا خاک میں ملا دیا" سوچ رہا تھا خُدا آئے، دیکھے اور میرے کہنے کو مانے، وہ اپنی کامیابی پر پہلے کی طرح خُوش ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اور اس کی خُوشی کے ساتھ سیلاب کی بربادی بھی ختم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ جو پودے سیلاب میں بہہ گئے تھے۔ وہ نئے مقاموں پر جم گئے تھے اور پہلے سے اور بھی بڑا باغ تیار ہو گیا۔ بچے ہوئے جانور اور انسانوں نے اپنی اپنی بستیاں بسائیں۔ سب خُوش تھے، جان بچی لاکھوں پائے۔ مصیبتوں کو کون یاد کرتا ہے۔ نئی زندگی نے نئی رونق پیدا کی۔ جب فرشتہ نے نیچے دیکھا، اس کے غصّہ کی انتہا نہ رہی۔ اپنے سب ہی ہتھیار استعمال کر چُکا تھا، سوچا جتنا ہی میں نے ان کو تباہ کرنا چاہا، اتنا ہی یہ پھلے پھُولے۔ ساری دُنیا میں پھیل کر انھوں نے اپنی ایک نئی دُنیا بسا لی ہے۔ لیکن ہار کیسے مانتا۔ سوچنے لگا میں اگر ان کو تباہ نہیں کر سکا ہوں، کم سے کم میں ضرور ایک بات میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ میں نے کسی کو اپنے گھر کا نہیں رکھا۔ کوئی پودا، کوئی جانور اور کوئی انسان ایسا نہیں ہے جو گھر سے بے گھر نہ ہو گیا ہو۔ میں نے ہر ایک کے دل میں غم ڈالا ہے اور ہر ایک کی پیشانی پر بَل ڈالا ہے۔ جب وہ یہ دعویٰ کر رہا تھا، اپنے سامنے ایک گھنے بانس کے جنگل سے ایک انسان آتا ہوا دیکھا۔ اس کا چہرہ روشن تھا، نہ دل میں غم تھا نہ پیشانی پر بَل تھا۔ فرشتہ سوچنے لگا — "یہ کون ہے؟" شاید چھپ گیا ہوگا" اس کو یاد آیا کہ خُدا نے کہا تھا کہ تم سب پر حملہ کر سکتے ہو،

لیکن میرے بندہ پر حملہ نہیں کر سکو گے۔ اگر تم نے ایسا کیا تو اسی روز قیامت آجائے گی اور تم بھی ختم ہو جاؤ گے۔ سوچا، کیا یہ "وہ" ہو سکتا ہے؟" کانپ گیا۔ پھر، "نہیں" "بچ کر نہیں جاؤ گے" "بچ کر نہیں جاؤ گے" تمہارا امتحان ہوگا۔ یہ سوچ کر اس نے ایک چڑیا کا جوڑا بنایا اور ان کو پیار کرتے کرتے اس روشن چہرے کے سامنے پہونچایا۔ شکاری بن کر ان میں سے نر کو ختم کر دیا۔ جب اس کی مادہ چیخی، اس کی آواز پر روشن چہرہ کے ہونٹ ہلے۔ جس طرح ستار کے بجانے پر بن بجائے طربیں خود بخود بجنے لگ جاتی ہیں، روشن چہرہ کے ہونٹوں سے بد دُعا نکلی ——

"ظالم" تو ان چڑیوں کا پیار بھی نہیں دیکھ سکا —— تیرا نام دُنیا میں نیکی سے کوئی نہیں لے گا۔"

فرشتۂ موت آگے کو جھکا اور ہاتھ جوڑ کر اس روشن چہرہ سے معافی مانگی، لیکن دل میں بہت خوش تھا، سوچ رہا تھا، بہت بے فکر، بے غم گھوم رہے تھے، کم سے کم ایک چڑیا کے مرنے کا غم تو پہنچا دیا۔

روشن چہرہ کے ہونٹوں سے جیسے ہی بد دُعا نکلی، وہ سوچنے لگا۔ میں نے تو بد دُعا نہیں دی، یہ بد دُعا، غم سے بھرے ہوئے الفاظ میرے مُنھ سے کیسے نکلے؟ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ وہ مُڑ گیا اپنے جھونپڑے کی طرف چلنے لگا۔ چلتے چلتے سوچتا تھا کہ اے خدا میرا دل برابر تجھ میں قائم ہے، یہ کیا ہوا؟ جب روشن چہرہ جھونپڑے کی طرف جا رہا تھا۔ فرشتۂ موت اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا، جس طرح ایک شکاری زخمی شکار کے

پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ فرشتۂ موت سوچ رہا تھا، خوش تھا۔ اب یہ بچ کر کہاں جائے گا۔

---

(۲)

روشن چہرہ اپنی جھونپڑی کے اندر چلا گیا۔ فرشتۂ موت بھی اس کے پیچھے اندر چلا گیا۔ روشن چہرہ نے ہرن کی کھال بچھائی، جھونپڑی کا دروازہ بند کیا۔ اور ہرن کی کھال پر بیٹھ کر خُدا کی عبادت میں غرق ہو گیا۔ وہ سوچ رہا تھا اور خُدا کو بار بار خطاب کر رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا کہ میں نے بد دُعا نہیں دی۔ میرا دل "اے خُدا صرف تجھ میں قائم رہا لیکن یہ سب کچھ کیا ہوا۔" کسی کو یہ بھید نہیں معلوم تھا یہ بھید صرف ہَوا کو معلوم تھا۔ ہَوا جھونپڑے کے بانسوں کے اندر گھُستی تھی اور باہر نکلتی تھی دُنیا والوں سے کہتی تھی کہ "اے دُنیا والو، اب نہ گھبراؤ تم کو تباہ و برباد کرنے والا آج خود ہی بند ہو گیا ہے۔ خُدا نے منع کیا تھا۔ سب پر حملہ کرنا۔ میرے بندہ پر نہ کرنا۔ یہ کمبخت اس کو بھول گیا۔ اب تو قیامت آئے گی" آسمان سے آگ برسے گی اور زمین پھٹ جائے گی۔" ہَوا اندر آتی رہی اور لوگوں کو جگاتی رہی۔ وہ کہتی تھی، "اُٹھ جاؤ! اے دُنیا کے غم زدہ لوگو اُٹھ جاؤ۔" تم سب مصیبتوں سے آزاد کر دئے گئے ہو۔ قیامت کا وقت نزدیک ہے۔ کہہ دو۔

جو کچھ کہنا ہے کہدو۔ جب بار بار ہوا بانسوں سے گذرنے لگی، جس طرح سارنگی کا گز، تاروں پر گذرتا ہے، بانسوں میں سے آواز آنے لگی، اے روشن چہرے! کیا سوچ رہے ہو؟ یہی ایک چڑیا کے مرنے پر تمھارے منھ سے بد دُعا کیسے نکل گئی؟ تم نے کبھی میری بابت نہیں سوچا۔ میں ہمیشہ سے تمھاری جھونپڑی کا بانس نہیں تھا۔ میں تمھارے باغ میں لگا تھا۔ ہرا بھرا تھا۔ تمھارے چیلے چانٹوں نے مُریدوں نے کس بے رحمی سے مجھے کاٹا تھا۔ مجھ کو کاٹ کر۔ پھاڑ پھاڑ کر کھپچیوں میں تبدیل کیا اور پھر ان مُونج کے بندھوں سے باندھ کر تمھاری یہ جھونپڑی تیار کی۔ تم کھڑے کھڑے یہ تماشہ دیکھتے رہے۔ اس وقت تمھارا رحم دل کہاں چلا گیا تھا۔ میں چیختا چلّاتا رہا۔ "کوئی بچائے، کوئی بچائے" کسی نے بھی میری پرواہ نہیں کی۔ میں ان مُونج کے بندھوں سے بندھا ہوا ہوں۔ اور سوکھتا چلا جاتا ہوں۔ میں تم کو ہمیشہ گالیاں دیتا تھا' کہتا تھا۔ بڑے پاکھنڈی ہو' دھوکے باز ہو' فریبی ہو' مہاتماؤں کی شکل بنائی ہوئی ہے لیکن اپنی زندگی خود غرضی پر قائم رکھتے ہو۔ آج مُنھ سے بد دُعا نکلنے پر پریشان ہو۔ جب میری زندگی ختم ہو رہی تھی تو میرے لئے پریشان کیوں نہیں ہوئے؟ میں برابر سوچتا رہا لیکن آج مجھے معلوم نہیں کیوں میں کچھ اور ہی سوچنے لگا ہوں۔ سب شکایتیں میرے دماغ سے چلی گئیں ہیں۔"

روشن چہرہ بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا۔ اس کا چہرہ برابر پہلے سے

اور زیادہ روشن ہوتا چلا جا رہا تھا۔ جو دوسروں کے غم سمیٹتا ہے، اس کا چہرہ ہمیشہ روشن ہو جاتا ہے۔

بانس بولا، "میں آج کچھ اور ہی طرح سے سوچ رہا ہوں۔ میں سوچتا ہوں، اگر میں کاٹا نہ جاتا، اگر میں پھاڑا نہ جاتا اور اِن مُونج کے بندھوں سے باندھا نہ جاتا تو تجھ جیسے نُورانی چہرہ کے جھونپڑے کا بانس کیسے کہلاتا۔ یہ نورانی چہرہ مجھے دیکھنے کو کیسے نصیب ہوتا؟

مُونج کے بندھ نُورانی چہرہ کو خطاب کرنے لگے، "اے نُورانی چہرہ یہ بانس کیا کہتا ہے۔ میں نے اس کو کہاں باندھا ہے۔ میں تو خود بندھی ہوئی ہوں۔ میں کیوں اس کو باندھتی؟ میں تو یہاں نہیں تھی۔ میں تو گنگا کے کنارے لگی تھی۔ گنگا مہارانی میرے پیر دھوتی تھی۔ تمہارے چیلے چانٹوں نے، مُریدوں نے بڑی بے رحمی سے مجھے کھود کھود کر گھر سے بے گھر کیا۔ پانی میں ڈال کر سڑایا کوٹ کوٹ کر میرا ایک ایک ریشہ علیحدہ کر دیا۔ بَٹ بَٹ کر، کاٹ کاٹ کر، جب میں باندھی جا رہی تھی، میں چیخ رہی تھی، چلّا رہی تھی، کسی نے میری طرف دھیان نہیں دیا۔ میں تم کو ہمیشہ گالیاں دیتی رہی، بُرا بھلا کہتی رہی۔ لیکن آج، نہ معلوم مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں سوچتی ہوں اگر میں گھر سے بے گھر نہ ہوتی، گلائی نہ جاتی، کُوٹی نہ جاتی۔ بٹی نہ جاتی، کاٹ کاٹ کر باندھی نہ جاتی، تو اے روشن چہرے! تیرے جھونپڑے کے بندھ کیسے کہلاتی۔ مجھے تجھ سے اب کوئی شکایت نہیں رہ گئی ہے۔

ہوا برابر اندر جا رہی تھی اور جو کچھ جھونپڑے میں ہو رہا تھا، اس کو باہر والوں کو سُنا رہی تھی۔ جھونپڑے میں رکھی ہوئی روشن چہرہ کی وینا[1] کے تار ہوا سے ہلے اور بولنے لگے، "اے روشن چہرہ! کبھی تم نے ہمارے بابت سوچا جو آج تم چڑیا کے مرنے پر سوچ رہے ہو۔ ہم یہاں تو نہیں تھے۔ تمھارے چیلے چاٹوں نے، تمھارے مُریدوں نے ہمیں پہاڑوں سے کھود کھود کر گھر سے بے گھر کیا۔ بھٹّیوں میں پگھلایا، تپایا۔ کُوٹ کُوٹ کر، کھینچ کھینچ کر ہماری یہ شکل بنائی اور کھونٹیوں میں باندھ کر کسا۔ اب، جب تم مضراب سے ہم کو مارتے ہو ہم چیختے چلّاتے ہیں۔ تم کہتے ہو، "آہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا...... ! کیا راگ نکل رہا ہے، کیا یہی تمھارا مذہب ہے؟ یہی تمھاری تہذیب ہے؟ کوئی مرے، تمھارا دل بہلے، ہم تمھیں ہمیشہ گالیاں دیتے تھے۔ دھوکے باز اور مکّار کہتے تھے، لیکن آج نہ جانے ہمیں کیا ہو گیا ہے۔ ہم سوچتے ہیں، اگر ہم گھر سے بے گھر نہ ہوتے ہمیں بھٹّیوں میں تپایا اور گلایا نہ جاتا۔ اور کُوٹ کُوٹ کر، کھینچ کھینچ کر تاروں میں تبدیل نہ کیا جاتا۔ اور کھونٹیوں پر باندھ کر، کس کر، مضراب سے مارا نہ جاتا، تو تجھ جیسے روشن چہرہ کے خیالات کے ظاہر کرنے کی طاقت ہم میں کیسے آتی؟ یہ سوچ کر اب ہمیں تجھ سے کوئی شکایت نہیں رہ گئی ہے۔

طبلہ بولا، "اے روشن چہرہ! میں ہمیشہ سے یہاں نہیں تھا۔ کسی کو

---

[1] پُرانے زمانہ کا ایک قسم کا ستار جیسا آلہ

مارا گیا تھا، اس کی کھال اُتروائی گئی تھی اور پکائی گئی تھی۔ تسموں سے باندھ کر، کھینچ کر، تم ہم کو ہاتھوں سے مارتے ہو اور ہم چلّاتے ہیں —— ہائے مرے، ہائے مرے! لوگ کہتے ہیں کتنی اچھی تال نکل رہی ہے۔"

وہ ہرن کی کھال جس پر روشن چہرہ بیٹھے ہوئے خدا کی عبادت کر رہا تھا۔ اور زندگی و موت پر سوچ رہا تھا۔ بولی، ——" اے روشن چہرہ! اس چڑیا کی طرح جس کی موت پر تو سوچ رہا ہے میں بھی کبھی زندہ تھا۔ یہیں کھیتوں میں چرتا تھا۔ راجہ نے مجھے مارا، کھال اُتروا کر آپ کو دی آپ نے اس کا شکریہ ادا کیا تھا، بد دعا نہیں دی تھی۔ تب آپ کا رحم دل کہاں چلا گیا تھا؟ میری بیویاں ابھی تک میرا انتظار کر رہی ہیں۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے تلاش کر رہی ہیں۔ انتظار کرتے کرتے ان کی آنکھیں باہر نکل آئیں ہیں۔ بڑی بڑی نظر آتی ہیں۔ ظالمو! تمھارے شاعروں کے "استعارے" بن گئی ہیں اپنی معشوقہ کی آنکھوں کو مرگ نینی، چشمِ آہو کہتے ہیں، کبھی نہیں سوچتے، اتنی بڑی آنکھیں کبھی کسی کی ہوتی ہیں؟

ابھی ہرن اپنی بات پوری کہہ بھی نہیں پایا تھا کہ کچھ آوازیں جھونپڑے کے باہر سے آنا شروع ہوئیں۔ گرے ہوئے پتّے ہوا میں کھڑ بڑ کر رہے تھے۔ کچھ عرصہ بعد سمجھ میں آیا۔ کچھ بول رہے تھے، " اے روشن چہرہ! اے روشن چہرہ! ہم کو دیکھو۔ ہم نے ان درختوں کو پالا تھا۔ کھانا بنا کر کھلایا تھا۔ سورج کی گرمی اور بارش کے تھپیڑے ہم نے برداشت کیے تھے۔ ان درختوں کو پال پوس کر اتنا بڑا اور شاندار بنایا۔ ہم خیال کرتے

تھے بڑھاپے میں ہماری یہ دیکھ بھال کریں گے لیکن انہوں نے ہمیں جھاڑ دیا۔ کیا تمھاری دُنیا کے ایسے ہی اُصول ہیں۔"

جب پتّے شکایت کر رہے تھے، درختوں میں سے ایک درخت بولا "اے روشن چہرہ، یہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ ہم نے ان کو پانی دیا، زمین سے لاکر ان کو خوراک پہنچائی۔ سُورج دِکھلایا۔ ان کی برابر خدمت کرتے رہے۔ لیکن جب مصیبت کا وقت آیا، ہم سوچتے تھے سردی میں یہ ہمیں چاروں طرف سے بچائیں گے، گرم رکھیں گے، انہوں نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔ ہم نے ان کو نہیں چھوڑا ہے یہ خود ہمیں چھوڑ کر چل دیے ہیں۔ دُنیا میں لوگ اسی طرح دُنیا کو چھوڑ دیتے ہیں۔ تاکہ وہ فقیر اور پیر بنیں اور عزت پائیں، اُن کی پرستش ہو۔ اب یہ سڑیں گے۔ گلیں گے اور انسان ان کو ٹوکریوں میں رکھ کر، سر پر اُٹھا کر کھاد کی شکل میں بیچے گا۔ ان کی قیمت بڑھے گی۔

یہ سُن کر درخت کی جڑ بولی "اے روشن چہرہ! کچھ میرا حال بھی سُنو۔ میں درخت کو کِھلاتی ہوں۔ میں اسے پالتی ہوں۔ میں زمین میں دھنسی ہوں۔ میرا کوئی نام بھی نہیں جانتا۔ درخت کہتا ہے زمین میں دھنسی رہو تمھارے لئے پردہ میں رہنا ہی اچھا ہے۔ جتنا تم زمین میں دھنسی ہوگی، میں اتنا ہی سیدھا کھڑا رہوں گا۔ لیکن اگر زمین کے باہر ٹہلنے کے لیے میں نکل آؤں۔ تب اس کو پتہ چلے گا کہ وہ کیا ہے اور میں کیا ہوں۔ دُنیا والے اپنی اپنی باتیں بناتے ہیں۔ جس کے سہارے پر کھڑے ہوتے

ہیں، اس کا ذکر نہیں کرتے۔ اوپر ہی اوپر دیکھتے ہیں۔ بُنیاد کا خیال ان کو کبھی نہیں ہوتا۔ اس زمین نے مجھے قید کر رکھا ہے کیا کروں، مجبور ہوں۔ ورنہ میں بھی زندہ ہوں، زندگی کے سب ہی لطف اُٹھانا چاہتی ہوں۔ مجھے بھی عیش و عشرت کا حق ہے۔"

زمین بولی، "میں نے کب اس کو قید کر رکھا ہے؟ میں تو خود مصیبت میں پھنسی ہوں۔ انسان نے میرے جگر کو ہَل چلا چلا کر چاک کر دیا ہے۔ اور جب اس کے ستم نہ برداشت کرکے میں چیخنا چاہتی ہوں، آہ بھرنا چاہتی ہوں، تو فرشتے کہتے ہیں"——"ایسا نہ کرو۔ دُنیا جل کر ختم ہو جائے گی میں تڑپ بھی نہیں سکتی۔ یہ ہمالیہ پربت، اراولی پربت، وندھیاچل پربت، مہیندر پربت اِراکان یوُما اور سُلیمان کی پہاڑیاں چاروں طرف کھونٹے کی طرح گاڑ دیے گئے ہیں تاکہ میں ہِل بھی نہ سکوں۔"

ہمالیہ بولا——"اے روشن چہرہ! میں نے زمین کو کیسے گاڑا ہے۔ میں نے تو خُدا سے کہا تھا کہ تیری عبادت میں زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ ایسی جگہ بتا جہاں بغیر کسی خلل کے تیری عبادت کرتا رہوں۔" اس نے کہا۔ "سمندر کے نیچے بیٹھ کر کر۔" جب میں اپنی عبادت کے سہارے اُبھرا، تو میں نے کون سا قصور کیا۔ مجھ کو بدنام کرنے کے لیے، تباہ و برباد کرنے کے لیے دُنیا والوں نے ہزاروں ندیاں مجھ پر ڈال دی ہیں۔ یہ گنگا مہارانی، جمنا مہارانی، برہم پُتر اور سِندھ غرض کہ لاکھوں ندی نالے مجھے کاٹ کاٹ کر برباد کر رہے ہیں۔"

چاند بولا——"اے روشن چہرہ! میں نے کون سا گناہ یا

قصور کیا تھا۔ جو قدرت نے مجھے یہ سزا دی کہ میں گھٹوں۔ اگر میں خوبصورت ہوں تو یہ خُدا کی دین ہے میری خوبصورتی دیکھ کر فرشتوں نے زبردستی میری شادی ان اٹھائیس لڑکیوں[1] سے کر دی۔ میں سب سے برابر محبت کیسے کر سکتا تھا، اگر میں نے ان میں سے صرف ایک سے ہی محبت کی تو اس میں میرا کیا قصور تھا۔ مجھ کو حکم ہوا اور سزا دی گئی ہے کہ میں گھٹوں۔"

سُورج بولا، " اے روشن چہرہ! میں نے کون سے گناہ کیے تھے کہ مجھ کو جلنے کا حکم ہوا؟"

باغ کی طرف سے ایک ٹھنڈی ہَوا کا جھونکا آیا، جیسے کسی مصیبت زدہ نے آہ بھری ہو۔

کلی بولی، " اے روشن چہرہ! مجھ کو دیکھ، میں نے کس محبت سے اس پھول کو پالا تھا۔ اور جب پال پوس کر بڑا کیا، اس نے مجھے چٹخا دیا۔ کیا دُنیا کا ایسا ہی رواج ہے۔ جو پالے وہ اسی کے ہاتھوں سے ختم ہو، جس کو اس نے پالا ہو"

ابھی کلی اپنی بات ختم کرنے بھی نہ پائی تھی کہ پھول جھڑ چکا تھا، زمین پر پڑا پڑا بولا، " اے روشن چہرہ! میں نے اس کو کہاں چٹخایا ہے۔ میری جوانی، میری خوبصورتی کا فائدہ اٹھا کر مجھ سے اپنا کام کروا کر

---

[1] چاند ۲۸ برجوں میں گردش کرتا ہے۔

اس کلی نے خود ہی مجھے جھاڑ دیا ہے۔"

روشن چہرہ کی جھونپڑی میں سُورج، چاند، تارے سب جمع ہو گئے تھے، سارے جہاں کا نُور اس میں سما گیا تھا۔ خُدا خود ہی آ گیا تھا۔ روشن چہرہ سے بولا "اب کیا سوچ رہا ہے؟ دُنیا کی ہر ایک زندگی نے اپنے دل کا حال تجھ کو سُنا دیا۔ اپنا بھید تجھ کو بتا دیا۔ تو اس کو لکھ دُنیا کو بتا کہ زندگی کیا ہے؟ اور موت کیا ہے؟ تاکہ انسان سمجھے۔"

جھونپڑی میں اتنا نُور تھا، اتنی روشنی تھی، فرشتۂ موت کو چھپنے کی جگہ نہیں ملی۔

روشن چہرہ نے اپنی عبادت ختم کی آنکھیں کھولیں تو اس کی نظر اس نوجوان لڑکے پر پڑی جو درخت کی ٹیک لگائے، پیر پھیلائے بیٹھا تھا۔ اس نے اس سے سوال کیا۔ "اے نوجوان صاحبزادے! سب بولے، تم خاموش کیوں ہو؟"

لڑکا، نوجوان بولا —— "آپ کے کرم سے میں نے سب کچھ دیکھا سب کچھ سمجھ میں آگیا ہے صرف ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔"

روشن چہرہ —— "بولو، کیا بات ہے؟"

فرشتۂ موت کو جب چھُپنے کی کوئی جگہ نہ ملی تو وہ روشن چہرہ کے پیچھے جا کر ان کے سایہ میں چھپ گیا، جو اس وقت ایک نقطہ کی شکل میں ظاہر ہو رہا تھا۔

لڑکا بولا —— "اے روشن چہرہ! یہ آپ کے پیچھے کالا کالا ایک

نقطہ سا کیا ہے ؟"

روشن چہرہ ——— " یہ تو میرے جسم کا سایہ ہے۔ یہ تو میرے ساتھ ہمیشہ ہی رہے گا۔ لیکن تو روشنی کی طرف دیکھ تیرے سامنے یہ کبھی نہیں آئے گا۔"

لڑکے نے اپنی آنکھیں کھولیں، حیران ہوگیا۔ اسے معلوم ہوا کہ درخت کی ٹیک لگا کر جب وہ بیٹھا تھا تو سوچتا سوچتا وہ سو گیا تھا۔ اور نیند میں فرشتۂ موت سے باتیں کرتا کرتا وہ دُنیا کا سارا تماشہ دیکھ گیا تھا۔ سُورج کی تیز روشنی جو مشرق سے اس کے چہرہ پر پڑ رہی تھی اور خواب کی آخری جھلک "تو روشنی کی طرف دیکھ، تیرے سامنے 'وہ' کبھی نہیں آئے گا " نے اس کو جگا دیا تھا۔

وہ اُٹھا، بہت شرمندہ تھا، سوچ رہا تھا کتنا بے وقوف و احمق تھا اگر میں وہ سب کچھ کر بیٹھتا جو میں کرنے آیا تھا تو کتنی غلطی کرتا۔ میری بیوی رات بھر انتظار کرتے کرتے، روتے روتے سو گئی ہو گی۔ میرے بوڑھے ماں باپ اپنا سہارا کھو جانے کے خیال سے رات بھر تڑپتے رہے ہوں گے۔ معلوم نہیں کہاں کہاں ڈھونڈا ہو گا۔ میری وجہ سے ان کو کتنی تکلیف پہنچی ہو گی۔ ان خیالوں میں وہ غرق تھا۔ اس کے قدم اب جلدی جلدی گھر کی طرف چلے جا رہے تھے۔ وہ زندگی کا بھید سمجھ گیا تھا۔ ہونٹ اس کے ہل رہے تھے ایسا لگتا تھا کہ

وہ کچھ جپ رہا ہے۔ کہہ رہا ہے ——— "تو روشنی کی طرف دیکھ، تیرے سامنے "وہ" کبھی نہیں آئے گا۔"

تو روشنی کی طرف دیکھ، تیرے سامنے "وہ" کبھی نہیں آئے گا۔"